در کفے جامِ شریعت، در کفے سندانِ عشق

ہر ہوسناکے نداند جام و سنداں باختن

بیادگار

حضرت ابوالبرکات سید حسن قادری گیلانی

رحمۃ اللہ علیہ

پندرہ روزہ

پشاور

الحسن

شاہ محمد غوث اکیڈمی یکہ توت، پشاور

شاہ محمد غوث اکیڈمی پشاور کا علمی مجلہ بیادگار حضرت ابو البرکات سید حسن صاحب قادری رحمۃ اللہ علیہ

رجسٹرڈ نمبر پی ۳۶۹

پندرہ روزہ

الحسن پشاور

مدیر اعلیٰ
فقیر محمد امیر شاہ
قادری گیلانی

منتظم اعلیٰ
سید غلام الحسنین
قادری گیلانی

شمارہ نمبر ۱۷۱ — جلد نمبر ۱۵

یکم تا ۱۵ دسمبر ۱۹۹۹ء — بمطابق رمضان المبارک ۱۴۲۰ھ

مدیر اعلیٰ (فقیر) محمد امیر شاہ قادری گیلانی نے رضوان پرنٹرز قصہ خوانی بازار پشاور سے
طبع کر کے یکہ توت پشاور سے شائع کیا

فہرست مضامین

نمبر شمار	عنوان	مضمون نگار	صفحہ نمبر
(۱)	یوم شہادتِ علی علیہ السلام	اقبال ریاض	۲
(۲)	دم ہمہ دم علی علی (نظم)	مولانا کوثر نیازی مرحوم	۷
(۳)	تفسیر القرآن الحسنیہ	مدیر اعلیٰ	۸
(۴)	مولا علی علیہ السلام	مولانا کوثر نیازی مرحوم	۱۰
(۵)	منقبت (نظم)	شاہ نیاز احمد قادری چشتی رضی اللہ عنہ	۱۵
(۶)	کہتے ہیں جس کو عشق	آصف اقبال قادری	۱۶
(۷)	استفتاء (نماز عید کے بعد مصافحہ و معانقہ)	مفتی خلیل الرحمن قادری	۲۴

یومِ شہادتِ علی کرم اللہ وجہہ الکریم

اقبال ریاض

علی کے نام میں فرحت بھی ہے حرارت بھی | علی کے نام میں طاقت بھی ہے شجاعت بھی
علی کا نام کئی منہ بگاڑ دیتا ہے | علی کا نام جنوں کو پچھاڑ دیتا ہے

یہ اشعار حضرت ظہور حیدر جارچوی کے ہیں جو کہتے ہیں کہ

علی کو مان لو علی سے پیار کرو | نفاق چھوڑ دو راہ راست اختیار کرو

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے تھے "میں علم کا شہر ہوں تو علی اس کا دروازہ ہے"۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ بھی ارشاد ہے کہ "اے علی (کرم اللہ وجہہ) تم کو مومن کے علاوہ کوئی دوست نہیں رکھے گا اور منافق کے علاوہ کوئی تمہیں دشمن بھی نہیں سمجھے گا"

حضور نبی کریم سرورِ کائنات حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشادات گرامی میں کس کو شک ہو سکتا ہے؟ اسے ایک حقیقت تصور کیا جاتا ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے داماد اور چچازاد بھائی ہونے کے علاوہ بھی ان کے بہت قریب تھے۔ حضرت علی علیہ السلام شیرِ خدا تھے جبکہ ہر معرکہ اور جنگ میں لوائے (جھنڈا) نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ہاتھ میں ہوتا تھا۔ آپ کی شہادت ۲۱ رمضان المبارک جمعہ کے دن فجر کے وقت ہوئی۔

حضرت امام حسن علیہ السلام سے روایت ہے کہ ایک سحر کو میں امیر المومنین کی خدمت میں حاضر ہوا تو فرمایا کہ فرزند رات بھر جاگتا رہا ہوں۔ ذرا سی دیر ہوئی کہ بیٹھے بیٹھے آنکھ لگ گئی تھی۔ خواب میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھا تو میں نے عرض کیا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آپ کی اُمت سے میں نے بڑی تکلیف پائی ہے، فرمایا "دعا کرو اللہ تعالیٰ تجھے ان سے چھٹکارا دلا دے" اس پر میں نے دعا کی۔ "یا اللہ! مجھے ان لوگوں سے نجات دلا دے اور اچھے لوگوں سے ملا دے"

مولانا ابوالکلام آزاد کے ایک مضمون کے مطابق بعض روایتوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے قلب میں آنے والے حادثے کا احساس پیدا ہو گیا تھا۔ انہی بعض روایات

کے مطابق جنگ صفین نے مسلمانوں میں ایک نیا فرقہ خوارج پیدا کر دیا تھا جس میں شامل لوگ انتہائی قسم کے سیاسی اور دینی مقاصد اور خیالات رکھتے تھے۔ چنانچہ انہی خارجیوں کے ایک گروہ نے مکہ میں بیٹھ کر سازش کی کہ اگر وہ حاکم مصر عمرو بن العاص، معاویہ بن ابو سفیان اور خصوصاً حضرت علی بن ابی طالب کو قتل کر دیں تو ساری تاریخ بدل سکتی ہے۔ چنانچہ منصوبہ بندی کی گئی، گروہ میں شامل ایک شخص عمرو بن بکر تمیمی نے کہا کہ میں حاکم مصر عمرو بن العاص کو قتل کر دوں گا۔ برک بن عبداللہ تمیمی نے کہا کہ میں معاویہ بن ابو سفیان کو قتل کر دوں گا، علی کے نام سے سب کانپتے تھے۔ بالآخر عبدالرحمن ابن ملجم نے مہر سکوت توڑی اور کہا "میں علی کو قتل کروں گا" ان ہولناک مہموں کے لئے ایک تاریخ مقرر کی گئی۔ دو پہلے افراد تو اپنی مہم میں ناکام رہے لیکن عبدالرحمن بن ملجم کامیاب ہو گیا۔

ایک اور روایت کے مطابق عبدالرحمن مکہ سے چل کر کوفہ پہنچا یہاں بھی خوارج کی ایک خاصی تعداد موجود تھی۔ ایک روز اس کی ملاقات ایک قبیلے کے بعض خارجیوں سے ہوئی جن میں ایک بڑی خوبصورت عورت قطام بنت شجنہ بھی موجود تھی، ابن ملجم اس پر فریفتہ ہو گیا۔ سنگدل عورت نے اسے یہ شرط پیش کی کہ میں جو مہر بھی طلب کروں وہ ادا کرو، ابن ملجم راضی ہو گیا۔ قطام نے اپنے مہر میں ایک بڑی شرط یہ بتائی کہ علی کو قتل کر دو۔ ابن سعد کی ایک روایت ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ جب بھی عبدالرحمن بن ملجم کی طرف دیکھتے تو ان میں یہ احساس پیدا ہو جاتا کہ اس شخص کے ہاتھ خون سے رنگین ہونے والے ہیں، وہ فرمایا کرتے "خدا کی قسم مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتلایا ہے کہ میری موت قتل سے ہو گی"۔

عبدالرحمن بن ملجم دو مرتبہ بیعت کے لئے آیا مگر آپ نے لوٹا دیا، تیسری مرتبہ آیا تو فرمایا سب سے زیادہ بدبخت آدمی کو کون سی چیز روک رہی ہے؟ کبھی کبھی اپنے ساتھیوں سے خفا ہوتے تو فرماتے تمہارے سب سے زیادہ بدبخت آدمی کو مجھے قتل کرنے سے کون سی چیز روک رہی ہے؟ خدایا میں ان سے اکتا گیا ہوں اور یہ مجھ سے اکتا گئے ہیں انہیں مجھ سے راحت دے اور مجھے ان سے راحت دے۔

ایک دن خطبہ فرمایا "قسم اس پروردگار کی جس نے بیج اگایا اور جان پیدا کی یہ ضرور اس سے

رنگ لانے والی ہے، اپنی داڑھی اور سر کی طرف اشارہ کرتے تھے فرمایا بدبخت کیوں انتظار کر رہا ہے ؟لوگوں نے عرض کیا یا امیر المومنین ہمیں اس کا نام بتایئے، ہم ابھی اس کا فیصلہ کر دیں گے فرمایا تم ایسے آدمی کو قتل کرو گے جس نے ابھی مجھے قتل نہیں کیا ہے۔ پھر عرض کی گئی تو ہم پر کسی کو خلیفہ بنا دیجئے۔ فرمایا نہیں میں تمہیں اسی حال میں چھوڑ جاؤں گا جس حال میں تمہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چھوڑ گئے تھے۔ لوگوں نے عرض کیا اس صورت میں آپ کرم اللہ وجہہ الکریم خدا کو کیا جواب دیں گے ؟ فرمایا کہوں گا خدایا میں ان میں تجھے چھوڑ آیا ہوں تو چاہے تو ان کی اصلاح کر دے اور چاہے تو انہیں بگاڑ دے۔

آپ علیہ السلام کی کنیز اُمِّ جعفر کی روایت ہے کہ آپ کے بعض اصحاب کو بھی اس کا پتہ چل گیا تھا۔ چنانچہ قبیلہ بنی مراد میں سے ہی ایک شخص نے حاضر ہو کر عرض کیا یا امیر المومنین ہوشیار رہئے یہاں کچھ لوگ آپ کو قتل کرنے کے منصوبے بنا رہے ہیں۔ یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ کس قبیلہ میں سازش ہو رہی ہے۔ ایک دن آپ نماز ادا کر رہے تھے کہ ایک شخص آیا اور عرض کی کہ ہوشیار رہئے قبیلہ بنی مراد کے کچھ افراد آپ کو قتل کرنے کی فکر میں ہیں۔ ایک روز کا واقعہ ہے کہ ایک شخص نے ابنِ ملجم کو تلوار لگاتے دیکھ لیا اور اسے کہا کہ مجھے اپنی تلوار دکھاؤ اس نے اسے تلوار دکھائی جو بالکل نئی تھی، اس شخص نے، جس کا نام اشعث بتایا جاتا ہے، ابنِ ملجم سے پوچھا کہ تلوار لگانے کی وجہ کیا ہے؟ حالانکہ اب زمانہ جنگ بھی نہیں ہے جس پر اس نے جواب دیا میں گاؤں میں اونٹ ذبح کرنا چاہتا ہوں۔ روایت کے مطابق اشعث سمجھ گئے اور اپنے خچر پر سوار ہو کر سیدھے حضرت علی علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہو گئے اور کہا آپ (علیہ السلام) عبدالرحمٰن ابنِ ملجم تیزی اور تندی سے تو واقف ہیں مجھے اس کی نیت میں فتور معلوم ہوتا ہے۔ حضرت علی علیہ السلام نے جواب دیا لیکن اس نے ابھی تک مجھے قتل نہیں کیا ہے۔

عبدالرحمٰن بن ملجم نے کوفہ میں شبیب بن بجرہ نامی ایک اور خارجی کو اپنا شریک کار بنا لیا تھا۔ دونوں تلوار لے کر چلے اور اس دروازے کے مقابل بیٹھ گئے جس سے امیر المؤمنین نکلا کرتے تھے۔ حضرت امام حسن علیہ السلام سے روایت ہے کہ عام طور پر آپ دروازے سے باہر نکل کر

لوگوں کو نماز کے لئے پکارا کرتے تھے جبکہ ایک روایت یہ بھی ہے کہ مؤذن کے پکارنے پر آپ اُٹھے نہیں بلکہ لیٹے رہے۔ مؤذن دوبارہ آپ کے پاس آیا مگر آپ اُٹھ نہ سکے۔ لیکن تیسری بار اس کی آواز پر آپ نے ایک شعر پڑھا جس کا مفہوم تھا۔ "موت کے لئے کمر کس لے کیونکہ وہ تجھ سے ضرور ملاقات کرنے والی ہے"

اس کے بعد آپ مسجد کی طرف چل دیئے۔ آپ جوں ہی آگے بڑھے، دو تلواریں چمکتی نظر آئیں۔ شیب کی تلوار تو طاق پر پڑی، لیکن ابن ملجم کی تلوار آپ کی پیشانی پر لگی اور دماغ تک اتر گئی، زخم کھاتے ہی آپ نے فرمایا "رب کی قسم میں کامیاب ہو گیا"۔

لوگ ہر طرف سے ٹوٹ پڑے، شیب تو کسی طرح نکل بھاگا لیکن عبدالرحمٰن بن ملجم کو وقت کے ایک پہلوان مغیرہ بن نوفل نے تلوار گھماتے ہوئے اس پر بھاری کپڑا ڈال کر زمین پر دے مارا۔ امیر المؤمنین علیہ السلام گھر پہنچائے گئے، آپ علیہ السلام نے قاتل کو طلب فرمایا۔ جب وہ سامنے آیا تو فرمایا او دشمن خدا! تم نے میرے احسانات کا بدلہ یہ دیا ہے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے بعد ازاں حضرت حسن علیہ السلام سے فرمایا "یہ قیدی ہے اس کی خاطر تواضع کرو، اسے اچھا کھانا دو، اگر زندہ رہا تو اپنے خون کا سب سے زیادہ دعویدار میں ہوں گا، قصاص لوں گا یا معاف کردوں گا لیکن اگر میں زندہ نہ رہا تو اسے بھی میرے پیچھے روانہ کر دینا، رب العالمین کے حضور اس سے جواب طلب کروں گا۔

اس سلسلے میں ایک روایت یہ بھی ہے کہ آپ نے مزید فرمایا کہ اگر تم اس سے قصاص لینے پر اصرار کرو تو چاہیے کہ اسے اسی طرح ایک ہی ضرب سے مارو جس طرح اس نے مجھے مارا لیکن اگر معاف کردو تو یہ تقویٰ سے زیادہ قریب ہے، دیکھو زیادتی نہ کرنا کیونکہ خدا تعالیٰ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا۔ حضرت علی علیہ السلام بعد ازاں بے ہوش ہو گئے، جب ہوش میں آئے تو ایک شخص جندب بن عبداللہ نے حاضر ہو کر کہا اے امیر المؤمنین! اگر خدانخواستہ ہم نے آپ کو کھو دیا تو کیا ہم حسن (علیہ السلام) کے ہاتھ پر بیعت کر لیں۔ آپ نے جواب دیا "میں تمہیں نہ ایسا کرنے کا حکم دیتا ہوں اور نہ اس سے منع کرتا ہوں، تم اپنی مصلحت اور بھلائی بہتر

طور پر سمجھ سکتے ہو"

روایت ہے کہ حضرت علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہ نے بعد ازاں اپنے صاجزادوں حضرت امام حسن اور حضرت امام حسین علیہم السلام کو بلایا اور انہیں آخری وقت پر وہ وصیت کی جس پر وہ زندگی کے آخری دم تک عمل پیرا رہے اور جس کی بناء پر آج ہر دل ان کی یاد میں تڑپتا ہے، ہر آنکھ اشک بار ہو جاتی ہے اور ان کے ایثار، قربانی اور اللہ تعالیٰ کے احکامات پر مکمل عملدر آمد کو اسلام کی سربلندی کے لئے ایک بڑی تقویت اور ضمانت تصور کیا جاتا ہے۔

ممتاز عالمِ دین حضرت مولانا سید نجم الحسن کراروی کی کتاب "الغازی" میں حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ایک روایت درج کی گئی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے سنا گیا کہ خدا نے دینِ اسلام کو علی ابن ابی طالب کے ذریعہ مستحکم فرمایا ہے۔ آپ نے اپنے صاجزادوں حضرت امام حسن اور حضرت امام حُسین علیہم السلام کو وصیت کی کہ وہ دنیا کا پیچھا نہ کریں اگرچہ دنیا تمہارا پیچھا کرتی ہے۔ جو چیز تم سے دور ہو جائے اس پر نہ کڑھنا، ہمیشہ حق کرنا اور حق کا ساتھ دینا، یتیم پر رحم کرنا، بیکس کی مدد کرنا، ظالم سے نفرت کرنا اور مظلوم کی حمایت کرنا، کتاب اللہ پر چلنا اور یہ خیال رکھنا کہ قرآن پر عمل میں کوئی تم سے بازی نہ لے جائے۔ خدا کے باب میں کسی اور کی پرواہ نہ کرو گے تو خدا تمہارے دشمنوں سے تمہیں محفوظ کر دے گا۔ خدا کے بندوں پر شفقت کرنا اور دیکھو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو نہ چھوڑنا خدا سے ڈرتے رہنا اور گناہ اور زیادتی میں کسی کی مدد نہ کرنا۔ اے اہلِ بیت! خدا تمہیں محفوظ رکھے اور اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے طریقہ پر قائم رکھے۔ میں تمہیں خدا کے سپرد کرتا ہوں، تمہارے لئے سلامتی اور برکت چاہتا ہوں"۔

اس کے ساتھ ہی آپ نے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ کہا اور اپنے خالقِ حقیقی کے پاس تشریف لے گئے۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے حضرت زید کی ایک روایت کے حوالے سے لکھا ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی شہادت پر بے شمار غمزدہ اور سوگوار دلوں میں جب قدرے سکون پیدا ہوا تو سب لوگ ایک ہجوم کی شکل میں ام المومنین کے گھر گئے تاکہ اس عظیم صدمے کے بارے میں ان کا حال معلوم کر سکیں لیکن جب اجازت چاہی تو معلوم ہوا کہ حادثہ کی خبر یہاں پہلے (باقی صفحہ آخر پر)

دم ہمہ دم علی علی

مولانا کوثر نیازی (مرحوم)

عجز ہے میری برتری، فخر مرا تونگری
فقر مری قلندری، سر پہ ہے دستِ حیدری
پیر میرا علی ولی
دم ہمہ دم علی علی، دم ہمہ دم علی علی

اللہ و مصطفیٰ ترے، دونوں جہاں گدا تیرے
کون و مکاں سدا ترے، قلب و جگر فدا ترے
باغ جناں تری گلی
دم ہمہ دم علی علی، دم ہمہ دم علی علی

عظمتِ حسنِ کبریا، اُلفتِ دینِ مصطفیٰ
دعوتِ فکرِ انبیاء، بیعتِ دستِ اولیاء
تیری ہی ذات سے چلی
دم ہمہ دم علی علی، دم ہمہ دم علی

قوتِ بازوئے نبی، عظمتِ نوعِ آدمی
سطوتِ علمِ عالمی، حشمتِ حلمِ ہاشمی
آپ کا وصف یا علی
دم ہمہ دم علی علی، دم ہمہ دم علی علی

کوثرِ خستہ گام کا، آپ کے اس غلام کا
دل جو ہوا ہے غمزدہ، آپ کو یاد کر لیا
سر سے ہر اک بلا ٹلی
دم ہمہ دم علی علی، دم ہمہ دم علی علی

گذشتہ سے پیوستہ

تفسیر القرآن الحسنیہ

مدیر اعلیٰ

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

اَلشَّهۡرُ الۡحَرَامُ بِالشَّهۡرِ الۡحَرَامِ وَالۡحُرُمٰتُ قِصَاصٌ ؕ فَمَنِ اعۡتَدٰى عَلَيۡكُمۡ فَاعۡتَدُوۡا عَلَيۡهِ بِمِثۡلِ مَا اعۡتَدٰى عَلَيۡكُمۡ ۖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعۡلَمُوۡٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الۡمُتَّقِيۡنَ (۱۹۴) وَاَنۡفِقُوۡا فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ وَلَا تُلۡقُوۡا بِاَيۡدِيۡكُمۡ اِلَى التَّهۡلُكَةِ ۖ وَاَحۡسِنُوۡا ۚ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الۡمُحۡسِنِيۡنَ (۱۹۵)

ترجمہ: حرمت والا مہینہ بدلے حرمت والے مہینے کے ہے اور حرمت والی چیز کا بدلہ ہے، پس جو شخص تم پر زیادتی کرے پس اس پر زیادتی کرو اتنی ہی جتنی کہ اس نے زیادتی کی ہے اور اللہ سے ڈرتے رہو اور جان لو کہ اللہ تعالیٰ جل جلالہٗ (کی مدد) پرہیزگاروں کے ساتھ ہے (۱۹۴) اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں (مال) خرچ کرو اور اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو اور بھلائی کرو، بے شک اللہ جل جلالہٗ بھلائی کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے (۱۹۵)

حلِ لغت: اَلشَّهۡر: مہینہ۔ اَلۡحَرَام: حرمت والا یعنی ان مہینوں میں لڑائی کرنا منع ہے[۱]، یہ چار مہینے ہیں ذی قعدہ، ذی الحج، محرم اور رجب۔ اِعۡتَدٰى: صیغہ واحد مذکر غائب ہے، زیادتی کرنا، ظلم کرنا، حد سے بڑھنا۔ لتَهۡلُكَة: ہلاکت، بربادی، ضائع کرنا، هَلَكَ يَهۡلِكُ کا مصدر ہے۔

تفسیر: اللہ تبارک و تعالیٰ جل جلالہٗ نے مسلمانوں کو حکم فرمایا تھا کہ تم حج پر جاؤ اور اگر مشرکین مکہ تمہارے ساتھ مقابلے میں آ جائیں تو تم بھی جہاد کرو۔ بیت اللہ شریف کی حرمت کا پاس رکھو اگر وہ حرم مبارک کی حدود میں تمہارے ساتھ لڑیں تو پھر تم بھی

[۱]: تفسیر حقانی، مولفہ مولانا عبدالحق دہلوی رحمت اللہ تعالیٰ علیہ، جلد ۲، صفحہ ۷۸، مطبوعہ اکمل المطابع دہلی۔

ان کے ساتھ مدافعانہ جنگ لڑو، اسی ضمن میں اس مقام پر شہر حرام کی حرمت کا ذکر فرمایا تاکہ ان مہینوں میں، جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے، لڑنا منع ہے۔ لہٰذا اگر وہ تمہارے ساتھ ان مہینوں میں زیادتی پر اُتر آئیں تو تم بھی جتنی زیادتی انہوں نے کی ہے ان کے ساتھ اتنی ہی کرو۔ گویا اجازت مرحمت فرمائی کہ اگر وہ ان مہینوں میں تمہارے ساتھ لڑائی پہ اُتر آتے ہیں تو تم بھی ان کے ساتھ جہاد کرو۔ ۶ ہجری میں جب مسلمان حج کے لئے آئے تو ذی العقدہ کے مہینے میں واپس کر دیئے گئے کیونکہ ذی العقدہ حرمت والے مہینوں میں سے ہے اور مسلمان بغیر لڑائی کے احترام شہر کرتے ہوئے واپس آگئے۔ اب اللہ جل جلالہٗ نے رخصت عطا فرمائی کہ الشہر الحرم جن میں لوگ حج پہ جاتے اور واپس آتے ہیں لہٰذا ان کی عزت، عظمت اور احترام واجب ہے۔ جب ان مشرکین نے ان ماہِ مبارکہ کا احترام نہ کیا اور تمہیں حج کے لئے نہ چھوڑا تو فرمایا کہ ان مہینوں کا بدلہ یہ مہینے ہیں اور حرمت، ادب و احترام برابری میں ہے زیادتی میں نہیں۔ لہٰذا اگر وہ تم پر زیادتی، ظلم کریں تو جتنی زیادتی و ظلم وہ کریں اتنی ہی تم ان پر کرو اور ہر حال میں اللہ تبارک و تعالیٰ کے احکام کا فرماں برداری کرتے رہو اور اس سے ڈرتے رہو اور یہ بات خوب ذہن نشین کر لو کہ اللہ جل جلالہٗ کی مدد و نصرت پرہیزگاروں کے ساتھ ہے۔ نیز یہ تعلیم بھی ارشاد فرمائی کہ اگر تمہاری جماعت میں ایسے افراد ہوں جو صاحبانِ استطاعت ہوں تو انہیں چاہیئے کہ وہ ان اصحاب کی مالی اعانت کریں جو کہ اس جہاد میں مصروف پیکار ہیں، ان کو اسلحہ خرید کر دیں اور ان کے دیگر اُمور زندگی پورے کریں۔

یہاں پر فرمایا کہ اپنے آپ کو اپنے ہی ہاتھوں تباہی و ہلاکت میں نہ ڈالو یعنی اتنا زیادہ خرچ نہ کرو کہ تم خود مفلس و نادار ہو جاؤ اور اور بھیک مانگتے پھرو تاکہ ذلیل و خوار ہو جاؤ یا بخل کر کے اپنے آپ کو جہنمی نہ بنا ڈالو اور لوگوں کی نظروں میں بھی حقیر بن جاؤ۔ اسی لئے فرمایا کہ بھلائی کرو، احسان کرو اپنے بھائیوں کی خدمت کرو اور یاد رکھو کہ وہی لوگ محبوب ہیں جو کہ احسان اور بھلائی کرنے والے ہیں یعنی دینِ اسلام کے غلبے کے راستے میں اللہ تعالیٰ کے احکام کی اطاعت کرتے ہوئے جناب سیّدنا و مولانا محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کی محبت و اتباع میں اپنی صحت، دولت، اولاد و تجارت کو رضائے الٰہی کے لئے خرچ کرتے ہیں۔ (جاری ہے)

مولا علی علیہ السلام

مولانا کوثر نیازی (مرحوم)

رات نشتر پارک کے جلسے میں میں نے کہا تھا کہ اس دور میں بدقسمتی سے تحقیق اور ریسرچ کے نام پر کچھ لوگ ان بہت سے مسلمہ تعبیرات اور تشریحات اور ارشادات کو بھی مشکوک بنانے کی کوشش کر رہے ہیں جو صدیوں سے مسلمانوں کے درمیان متفقہ رہے، ان میں سے کچھ کا حوالہ میں نے دیا تھا اور اپنی معروضات پیش کیں تھیں۔ ایک ایسا ہی ارشادِ رسول ﷺ آج بیان کروں گا جو بہت معروف ہے، بہت مشہور ہے اور شاید ہی کوئی مسلمان اس سے بے خبر ہو لیکن بدقسمتی سے وہی اہلِ تحقیق کچھ تو یہ جسارت کر رہے ہیں کہ اس کے ارشادِ رسول ﷺ ہی ہونے کا انکار کر دیں اور اگر ایسا ممکن نہ ہو سکے اور یہ روشن حقیقت مٹ نہ سکے تو پھر کم سے کم اس کی تشریح ایسی کر دی جائے، اس پر ایسی دھول اڑا دی جائے، اسے ایسا غبار آلود کر دیا جائے کہ وہ اپنی حقیقت واصلیت کھو بیٹھے۔ میری مراد اس ارشادِ رسول ﷺ سے ہے جو خطبہ غدیرِ خم میں حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا اور مختلف لفظوں کے ساتھ بیان ہوا ہے مگر یہ الفاظ تو بہت معروف ہیں من کنت مولاہ فعلی مولاہ یعنی میں جس کا مولا ہوں علی اس کے مولا ہیں۔

آپ جانتے ہیں کہ یہ ارشادِ رسول ہمارے ہاں اہلِ سنت کی محفلوں میں اور صوفیائے کرام کی محفلوں میں اور عرس کے موقع پر تمام قوال اپنی قوالی شروع کرنے سے پہلے قول کی صورت میں پیش کرتے ہیں اور یہ مشہور صوفی بزرگ محبوبِ الٰہی حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کے محبوب حضرت امیر خسرو نے اسے قوالی کے روپ میں ڈھال کر قول کے انداز میں اسے متعارف کرایا اور اس وقت سے اب تک یہ تمام اہلِ تصوف کے ہاں محافل سماع میں پیش کیا جاتا ہے۔

یہ ایسی روایت ہے جو ایک سو پندرہ صحابہ سے مروی ہے، ایک سو پندرہ صحابہ سے روایت ہے۔ کتابوں کے ۵۶ مفسرین کے میں نام نہیں لیتا طوالت ہو گی ورنہ نام ہیں۔ ۵۶ مفسرین اور محدثین نے اپنی کتابوں میں اسے صراحت کے ساتھ لکھا ہے اور ۸۴ تابعین نے اسے منقول کیا ہے یعنی یہ ایسی بات ہے کہ جو صدیوں سے ہمارے ہاں تواتر سے نقل ہوتی چلی آ رہی ہے اور نسلوں میں منتقل ہوتی چلی آ رہی ہے مگر بدقسمتی سے آج اس میں بھی شبہات ڈالنے کی کوشش کی

جا رہی ہے۔ اگر آج کوئی شخص میں نے دیکھا ہے بڑے سے بڑے عالم بھی اور احادیث پر نظر رکھنے والے بھی "مولا علیؑ" کہتے ہوئے جھجکتے ہیں اور "مولا علیؑ" کا لفظ کوئی کہہ بیٹھے تو گویا یہ اس بات کی علامت ہے کہ یہ آدمی جو ہے اس کا تعلق سوادِ اعظم سے نہیں ہے حالانکہ سوادِ اعظم میں شامل ہونے کے لئے یہ ضروری تھا کہ علی کو مولا مانا جائے اور جس کو مانا جائے پہچانا جائے اسے مولا کہا جائے تو اس میں کیا حرج ہے۔

اب جب یہ دیکھا کہ یہ ارشاد ایسا ہے کہ یہ مٹ نہیں سکتا، ختم نہیں ہو سکتا۔ تحقیق اور ریسرچ کے نام پر اس میں تشکیک کے کانٹے نہیں چبھوئے جا سکتے تو اب کہا کہ مولا کا مفہوم جو ہے وہ نہیں ہے جو سمجھا جاتا ہے اور جو عام طور پر اس حدیث کے ذیل میں لوگ لیتے ہیں۔

اب میں آپ سے عرض کرتا ہوں کہ قرآنِ پاک میں مولا کا لفظ ۲۱ مواقع پر استعمال ہوا ہے اور امام راغب سے لے کر شاہ عبدالحق محدث دہلوی کے ترجمہ قرآن تک جو مفہوم ان ۲۱ مقامات پر ہے اور میں اس تفصیل میں نہیں جانا چاہتا کہ کہاں اور کس مقام اور کن زعماء کے ساتھ یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ جو مفہوم ترجمہ نگار اب تک کرتے آئے ہیں وہ یہ ہیں: دوست، حمایتی، رشتہ کا بھائی، رب، سردار اور آقا۔

اب یہ حضرات کہتے ہیں کہ صاحب اس میں تو یہ ہی کہا ہے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ) نے کہ جس کا میں دوست ہوں علی اس کا دوست ہے یعنی اگر یہ بات آپ نے فرمائی ہوتی تو اس میں زور وزن اور جان تھی اور فصاحت اور بلاغت کے اصولوں کے مطابق بات تھی کہ جس کا علی دوست ہے اس کا میں دوست ہوں مگر بات یوں نہیں فرمائی آپ نے فرمایا یہ اگرچہ یہ مفہوم ہو جس کا میں دوست ہوں تو ظاہر ہے اس کا دوست تو علی ہو گا مگر یہ کوئی ایسی بات نہیں جو محتاج بیان ہو Common sense سے اپیل کرتے ہوئے میں عرض کر رہا ہوں کہ دوست کا مفہوم دینے کے لئے پھر جملے کی Construction بدلنی تھی پھر جملہ یوں نہ ہوتا۔

دوسرا مفہوم اگر "حمایتی" لیا جائے جس کا میں حمایتی ہوں علی اس کے حمایتی ہیں یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے اور اس انداز سے کہنے کی کہ تپتی دوپہر میں آپ نے "خطبہ حجتہ الوداع" دیا۔ خطبہ دینے کے بعد اعلان کرنے کے بعد مکہ اور مدینہ کے رستے میں لوگوں کو روک کر پھر آپ

خطبہ دیتے ہیں اور خطبہ دیتے ہوئے جو اعلان فرماتے ہیں اور اعلان یہ ہے کہ جس کا میں مولا ہوں علی اس کے مولا ہیں۔ کیا یہ سارا اہتمام جو آپ نے کیا صرف یہ اعلان کرنے کے لئے تھا کہ جس کا میں حمایتی ہوں علی اس کے حمایتی ہیں۔ یہ کوئی ایسی بات تھی جو محتاج بیان تھی یا جس میں تردد تھا کسی کو جس کی رسول حمایت کریں گے علی ان کی حمایت نہیں کرے گا، یہ کوئی شک کی بات تھی، پھر رشتہ کا بھائی جس کا میں رشتہ کا بھائی ہوں علی اس کے رشتے کے بھائی ہیں، یہ کوئی بچہ بھی جان سکتا تھا کہ جس سے آپ کی رشتہ داری ہے علی کی بھی اس سے رشتہ داری ہوگی کیونکہ آپ first cousin تھے۔ اب رہا رب، تو رب تو مفہوم ہو نہیں سکتا۔ جس کا میں رب ہوں علی اس کے رب ہیں یہ Out of question ہے۔

اب دو الفاظ رہ جاتے ہیں ترجمہ کے، وہی فٹ بیٹھتے ہیں، وہی اس کا مفہوم ہے، وہی اس کی مراد ہے جس کا میں سردار ہوں یا جس کا میں آقا ہوں اس کے علی سردار ہیں، اس کے علی آقا ہیں۔

اب ایک بات اور عرض کروں، یہ جو اعلانِ ولایت تھا حضرت علی کا جو رسول کی زبان سے ہوا ضروری نہیں کہ اس کے ساتھ حکومت ہو تب ولایت ہو ہاں اگر ولایت کے ساتھ حکومت ہو تو یہ حکومت کے لئے اعزاز ہے لیکن ولایت اس کی محتاج نہیں ہے کہ حکومت ہو تو ولایت ہو اور حکومت نہ ہو تو ولایت نہیں۔ اقبال نے یہ عجیب شعر کہا ہے

ہوئی نہ عام جہاں میں کبھی حکومتِ عشق سبب یہ ہے کہ محبت زمانہ ساز نہیں

عشق کی حکومت عام نہیں ہو سکی کیوں کہ محبت زمانہ ساز نہیں۔ حکومت کے لئے زمانہ سازی ضروری ہے، علی زمانہ ساز نہ تھے علی اصولوں پر مفاہمت کرنے والے نہ تھے۔ علی تو شمشیر برہنہ تھے۔ خلفائے راشدین کے زمانے میں تو خلفاء کا واسطہ مرتدین سے تھا، منافقین سے تھا کہ جو زکوۃ دینے سے انکار کر رہے تھے، مقابلے میں تھے ان سے مقابلہ کرنا کوئی مشکل کام نہ تھا لیکن علی مرتضٰی کی مشکل یہ تھی کہ ان کے بالمقابل کلمہ گو مسلمان تھے۔ کلمہ پڑھنے والے مسلمان تھے اور اور علی کو یہ ثابت کرنے کے لئے کہ اسلامی حکومت، اسلامی نظام اور اسلامی System تاراج کرنے کے لئے اگر مسلمان بھی بالمقابل آجائیں تو ان کی گردنیں بھی گاجر مولی کی طرح کاٹ دی جائیں گی۔

علی نے اس سے دریغ نہیں کیا۔ مگر بہت مشکل تھا، یہ زمانہ سازی کا کام نہ تھا۔ یہ کام وہ تھا جس کے لئے اصولوں پر مفاہمت نہیں ہو سکتی تھی اس لئے علی کی ولایت کے ساتھ حکومت کی Braket لگی ہو یا نہ لگی ہو اس سے کوئی خاص فرق واقع نہیں ہوتا اور کیا آپ کہیں امام حسن جب دستبردار ہو گئے تھے حکومت سے تو ولایت کیا ان کے پاس نہ رہی تھی؟ اور ہاں کیا حسین علیہ السلام جب سریرائے حکومت ہی نہیں ہوئے تو وہ سریرائے ولایت نہ تھے؟

ایک عجیب حدیث ہے اور میں حیران ہوں کہ اہلِ سنت اور شیعہ حضرات دونوں اس جانب توجہ کیوں نہیں کرتے؟ یہ بارہ امام جو شیعہ حضرات کے ہیں بلکہ میرے ہیں، وہ محض شیعہ حضرات کے کیوں ہوں گے۔ یہ جو بارہ امام ہیں ان کے بارے میں ایک عجیب حدیث ہے بخاری کی حدیث ہے اور چونکہ اہل علم بیٹھے ہیں میں نے مناسب جانا کہ وہ عرض کروں۔

بخاری جلد سوئم پارہ ۲۹ کتاب الاحکام اس میں جابر بن سمرہ سے روایت ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ حضور ﷺ سے میں نے سُنا کہ ۱۲ امیر ہو گے بارہ سردار ہوں گے۔ پھر وہ کہتے ہیں حضور ﷺ نے کچھ فرمایا مگر میں سمجھ نہیں سکا، میں سُن نہیں سکا۔ میرے والد کہتے ہیں کہ آپ (ﷺ) نے فرمایا وہ سب جو سردار ہیں بارہ وہ سب قریش میں ہوں گے۔ یہ بخاری کی روایت ہے اب تاریخ آپ دیکھ لیں قریش میں دو خاندانوں نے حکومت کی ہے، بنو اُمیہ نے، بنو عباس نے۔ بارہ سردار سے اگر آپ مراد لیں، بادشاہ مراد لیں تو نہ تو بنو امیہ میں ہوئے نہ بنو عباس میں یہ بارہ سردار یہ بارہ امام میں کہتا ہوں اگر ہوئے ہیں تو بنو ہاشم میں سرکار کے خاندان میں ہوئے اور یہ بارہ اہل بیت ہیں۔

یہ وہ سلسلۂ ولایت ہے جو سیدنا علی مرتضیٰ سے چلا اور جس کا اعلان سرکار نے غدیر خم کے موقع پر کیا اور آپ نے اعلان فرمایا کہ جس کا میں مولا ہوں علی اس کے مولا ہیں۔ ایک بات جس کی جانب میں توجہ دلانا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ تصوف جو ولایت ہی کی شاخ ہے ولایت ہی کا شعبہ ہے اور ولایت ہی کا سلسلہ ہے اس میں جتنے سلسلے ہیں قادریہ، چشتیہ، سہروردیہ، قلندریہ، یہ مشہور سلسلے یہ ہی ہیں، یہ سب کے سب نقشبندیہ کو چھوڑ کر قادریہ، چشتیہ، سہروردیہ، قلندریہ یہ سب کے سب صوفیاء میں مسلمہ ہیں کہ تمام سیدنا علی علیہ السلام سے

ملتے ہیں صرف ایک سلسلے کے بارے میں اختلاف ہے نقشبندیہ کے سلسلے میں۔

نقشبندیہ کے بارے میں دو گروہ ہیں ایک اسکول ہے سرہندی اور ایک ہے اکبر آبادی اسکول۔ یہ صوفیاء کے اسکول ہیں ان دونوں میں اختلاف ہے سرہندی سلسلے کے جو صوفیاء ہیں وہ کہتے ہیں کہ یہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے چلا ہے اور جو اکبر آبادی صوفیاء ہیں وہ کہتے ہیں نہیں یہ سلسلہ بھی منتہی ہوتا ہے حضرت سیدنا علی علیہ السلام پر اور جہاں تک مجھ عاجز کی تحقیق ہے اور تھوڑی سی حقیر ریسرچ ہے میں سمجھتا ہوں کہ اکبر آبادی اسکول اس معاملہ میں راستی پر ہے۔ اور اس کا سبب یہ ہے کہ جو سرہندی سلسلہ ہے وہ اس طرح حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقشبندیہ کا سلسلہ ملاتا ہے کہ وہ کہتے ہیں حضرت امام جعفر صادق تک تو یہ جاتا ہے وہاں سے وہ ان کے نانا جناب محمد ابن ابی بکر تک جاتے ہیں اور پھر وہاں سے ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ تک اور جو دوسرے حضرات ہیں اکبر آبادی وہ اسے جناب امام باقر سے جناب علی تک براہ راست لے جاتے ہیں۔ میں کہتا ہو اگر سرہندی سلسلہ ہی صحیح ہو کہ اس کا وہ تعلق جناب محمد ابن ابی بکر سے جوڑتے ہو۔

تو یہ سب جانتے ہیں جناب محمد ابن ابی بکر جب حضرت ابو بکر صدیق کا انتقال ہوا ہے تو بہت چھوٹی عمر کے تھے اور ان کی پرورش اور ان کی تربیت داماںِ مرتضٰی میں ہوئی ہے اور حضرت علی کے سایہ عاطفت میں انہوں نے پرورش پائی ہے اس لئے اگر وہ سلسلہ تصوف ان تک پہنچتا ہے تو اس ذریعہ سے بھی سیدنا علی مرتضٰی تک پہنچتا ہے تو تمام سلاسل تصوف اور اس میں کوئی Exception نہیں وہ سب کے سب جناب امیر تک پہنچتے اس لئے کہ وہی ولی ہیں اور ان ہی کی ولایت کا اعلان سرکار نے اپنے اس مشہور خطبہ میں کیا تھا۔

اس لئے حضرات میں اگر کہتا ہوں کہ اگر کوئی اعلان کرتا ہے جناب علی مرتضٰی کی ولایت کا تو کیا غلط کرتا ہے اور کیا برا کرتا ہے؟ اور جب کہ علی کی ولایت پر پردے ڈالے جارہے ہوں اور اخفا کیا جارہا ہو تو کیوں نہ اس اعلان کو میناروں سے بلند کیا جائے اور ہر جگہ سے اس کا چرچہ ہو اس لئے کہ یہ ہمارے ایمان کا حصہ ہے اور یہی ارشادِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔

(ماخوذ از مولا علی، مولانا کوثر نیازی، محمدی ایجوکیشن اینڈ پبلیکیشن ٹرسٹ کراچی ۱۹۹۵ء، صفحہ نمبر ۷۱-۷۹)

منقبت

امام الاولیاء سیدنا علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہ الکریم

شاہ نیاز احمد قادری چشتی نظامی بریلوی رحمۃ اللہ علیہ

زہے عز و جلالِ بوترابِ فخرِ انسانے
علیِ مرتضیٰ مشکل کشائے شیرِ یزدانے
ولیٔ حق، وصیٔ مصطفیٰ دریائے فیضانے
امامِ دو جہانے قبلۂ دینے و ایمانے
امیرِ کشور فقرے شہہ اقلیمِ عرفانے
خدا گوئے، خدا دانے، خدا بینے، خدا شانے
انیسِ محفل انسی، جلیسِ مجلسِ قدسی
سرورِ جانِ خاصانے، نشاطِ روحِ پاکانے
مہ ظلمت کشائے مشعلِ تاریکیٔ عالم
سراپا جلوۂ نورے تمامی مہر تابانے
براہ حق نمائی . ناقہائے کاروانش را
بنا شد جز ہدائے او کسی دیگر حدی خوانے
پیمبر بر سر منبر نشست و خواند مولائش
کہ تا مولائیش را باشد اندر خلق برہانے
عجب نبود بہار بے خزاں باغِ محباں را
کہ میبارد بروہر لحظہ ابرِ فیض و احسانے
نیاز اندر قیامت بے سرو ساماں نخواہی شد
کہ از حبّ و تولائے علی داری تو سامانے

کہتے ہیں جس کو عشق

آصف اقبال قادری

عاشق کے سینے میں عشق کا راکھ کر دینے والا الاؤ دہکتا ہے جس کی تپش کے ساتھ عاشق کے من میں بے کلی کے سمندر جنم لیتے ہیں جو لحہ بہ لحہ اُبلتے رہتے ہیں۔ من کے بحر میں سراغ زندگی پانے کی کوشش کے ساتھ بے چینی واضطراب کے پیچ و پیچ اس کے نفس کی ناؤ موجوں کی گود میں رواں دواں رہتی ہے۔ اس نیا کا کھیون ہار اس کے من مندر میں ایک مورت کی طرح قریب اور آکاش کے ماہِ تمام کی طرح دور ہوتا ہے۔ اب سینہ اختیاری و بے اختیاری کی کیفیات سے معمور ہو جاتا ہے۔ عشق کی جانب بڑھنے والوں کو جس اعزاز سے نوازا جاتا ہے وہ اعزاز کشمکش ہے۔ عشق کی بدولت ان کی صبحیں اور شامیں سوز و سازِ رومی اور پیچ و تابِ رازی سے بھرپور ہو جاتی ہیں۔

عشق کا دستور نرالا ہے ترکِ محبت کے بعد جسے نہ یاد کرنے کی ٹھانی جاتی ہے پہلے سے بڑھ کر یاد آتا ہے، اس کو بھول جانے کی کوشش دراصل اس کو یاد کرنا ہوتا ہے۔ سو محبوب کو دانستہ جتنا یاد نہ کیا جائے لذتِ فراق میں اُتنی ہی شدت آتی ہے۔ چارہ گری سوائے صبر نہیں مگر جب وصالِ یار ہی صبر ٹھہرے تو پھر چارہ کیا؟ مثنوی ''سفرِ عشق'' میں حضرت میاں محمد بخش رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔

''وہ دانا جو مریضِ عشق کا علاج وصال کے علاوہ کچھ اور تجویز کرتا ہے اسے نادان تصور کرو کہ وہ دل کے روگ سے قطعاً نا آشنا ہوتا ہے''

محبوب کے قرب کا احساس دل سے ہوتا ہے۔ آنکھیں تو دیدار کا وسیلہ ہیں۔ جب انسان جذبۂ عشق سے لذت آشنا ہوتا ہے تو اپنی ذات سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ چتا پر جل کر راکھ ہو جانا، ریگ زاروں میں آبلہ پائی پھر صحراؤں کو نقدِ جاں کا نذرانہ پیش کرنا، اپنے آپ کو چناب کی بے رحم

لہروں کے سپرد کرنا، زہر کا پیالہ پینا، یہ تمام غیر معمولی افعال جذبہ عشق ہی کا اظہار ہیں۔

یہ فطری امر ہے کہ انسان قاتل نظروں کا شکار ہو کر حضرتِ دل سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ پہلی نظر میں جب عشق دل میں بسیرا کرتا ہے تو اُنس و محبت کے مراحل آنِ واحد میں طے ہو جاتے ہیں اسیرِ زلفِ گیرہ گیر اور تیغِ ابروئے خمدار کا گھائل آتشِ عشق کی لذت سے آشنا ہو کر فرزانگی کے حصار سے نکلتے ہوئے دیوانگی کے نقطۂ عروج تک پہنچ جاتا ہے یہاں ہر دیوانہ پروانے کی طرح پوتراگنی کے طواف میں محوِ رقص ہو جاتا ہے۔ کوچۂ جاناں قبلہ ٹھہرتا ہے عشق کی بنیاد انسانی ظرف پر قائم ہے زیادہ سے زیادہ ظرف کا حامل زیادہ سے زیادہ دل شکستہ ہوتا ہے کیونکہ شکستہ آئینہ ہائے دل نگاہ آئینہ ساز میں سالم آئینوں کے مقابلے میں زیادہ عزیز ہوتے ہیں۔ حقیقی معنوں میں افضل ترین عشق کی مثال درویشوں کے ہاں پائی جاتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ جذبۂ عشق درویشوں ہی کے شایان شان ہے۔

یہ بات جُدا ہے کہ بیشتر حضرات بھی عشق کو دماغ کا خلل قرار دیتے ہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ جب عشق مجازی کی چنگاری خرمنِ دل کو جلا کر راکھ کرتی ہے تو دل میں عشقِ حقیقی کی تڑپ پیدا ہوتی ہے بالآخر یہ جذبہ ایک لاوے کی شکل میں کھولنے لگتا ہے عاشق کے مزاج میں سوز و گداز کی فراوانی پیدا ہو جاتی ہے۔ عاشق کی تمام سرگرمیاں معشوق کے لئے وقف ہو جاتی ہیں۔ عاشق کا دل تصورِ یار میں اس درجہ مستغرق ہو جاتا ہے کہ خود معشوق کا نام اس کے لئے اجنبی بن جاتا ہے اور شاعر ہونے پر اس کے جذبات موزوں ہو کر اثر انگیز اشعار کا روپ اختیار کر لیتے ہیں۔ علامہ شبلی نے "شعر العجم" میں لکھا ہے کہ "تصوف کا اصلی مایۂ خمیر عشقِ حقیقی ہے جو سراپا جذبہ و جوش ہے"۔

سید نور الحسن شاہ بخاری نے "صحابۂ کرام قرآنِ کریم میں" نامی کتاب میں اس بات کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ "عشقِ صادق بے نفسی اور بے غرضی کے اس نقطۂ عروج و زاویۂ کمال کا نام ہے جہاں ہر وقت ترکِ خویش و طلب دوست کے روح پرور نظارے مچلتے رہتے ہیں۔ عاشق صادق کو طلب حبیب و شوق وصال میں نہ اپنے نفع و نقصان کا فکر و خیال رہتا ہے اور نہ ہی

اپنی سدھ بدھ رہتی ہے۔ محبوب کی دھن میں وہ بہر حال مست اور مگن رہتا ہے اس لئے جو لوگ وادیٔ عشق میں قدم رکھتے ہیں وہ نہ کانٹوں سے گھبراتے ہیں نہ تلوے کھجلاتے ہیں، کٹھن سے کٹھن منزل میں بھی اہلِ عشق کے لب شکایت آشنا نہیں ہوتے"

عشق ایک مستقل کیفیت کا نام ہے جو وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی ہے۔ عشق محبوب کی یاد میں اس طرح مستغرق ہو جاتا ہے کہ محبّ کو اپنے وجود کا احساس تک نہ رہے' بظاہر دونوں کی انفرادیت قائم بھی رہتی ہے لیکن بہ نظرِ غائر دونوں باہمی لگاؤ کی وجہ سے ایک ہوتے ہیں اور یوں محبّ کو اپنے وجود سے محبوب کی خوشبو آتی ہے۔ حضرت امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ اس حالت کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

من تو شدم تو جاں شدی، تو جاں شدی من تن شدم
تاکس نہ گوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

مشہور ادیب اشفاق احمد فرماتے ہیں کہ ایک آدمی کے روبرو اپنی انا کو کچلنا عشق مجازی ہے اور مخلوق کے سامنے اپنی انا کو مارنا عشقِ حقیقی ہے۔ یوں تو عشقِ حقیقی خود انسان کی رہنمائی کرتا ہے لیکن کہا جاتا ہے کہ عشقِ حقیقی کے لئے عشقِ مجازی بحیثیت زینہ ضروری ہے۔ مثلاً کارل مارکس کا کہنا ہے "خدا کے ساتھ محبت کا رشتہ صرف اطاعت کا رشتہ ہوتا ہے اور اس تک پہنچنے یا اس کے ثمرات حاصل کرنے سے پہلے بندے کے لئے عشقِ مجازی اور اخوت و برادری کے انسانی رشتے قائم کرنا ضروری ہوتا ہے"

تصورِ عشق کی بنیاد کا پتہ ہمیں پنجابی شاعر حضرت وارث شاہ رحمۃ اللہ علیہ کی شہرۂ آفاق کتاب "ہیر" کے پہلے شعر میں ملتا ہے فرمایا۔

"خدا کی سب سے بڑی صفت وارث شاہ کی نظر میں یہ ہے کہ" اس نے اس جگ کا بنیادی اصول عشق بنایا اور خود محبّ بن کر اپنے محبوب رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم سے عشق کیا"

اللہ تعالیٰ خود اپنے مخلص بندوں کا عاشق ہے اگر وہ اس کی طرف ایک قدم چلتے ہیں تو وہ ان کی سمت دس قدم آتا ہے۔ حضرت غوث الاعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے الہامات میں سب سے پہلا الہام یہ

ہے کہ بندوں کا بہترین طالب خدا تعالیٰ ہے اور اللہ تعالیٰ کو بہترین مطلوب انسان ہے۔ یہ شرف انسان کو اس لئے حاصل ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات اور اس کے حسن و جمال کا آئینہ ہے۔ کائنات میں موجود ذرہ ذرہ عشق کی بدولت خدا کی تسبیح و تہلیل میں مصروف ہے۔ روح میں یہ اضطراب پایا جاتا ہے کہ وہ ہر وقت اپنے اصل کی جانب رجوع کرنے کے لئے بے تاب رہتی ہے یہ اضطراب بھی عشق ہی کا نتیجہ ہے جیسا کہ مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مثنوی میں یہ شعر لکھا۔

بشنو از نے چوں حکایت می کند | وز جدائی ہا شکایت می کند

بانسری کی درد بھری آواز اس غم کی ترجمانی کرتی ہے کہ اسے بانس کے جنگل سے کاٹ کر جدا کر دیا گیا ہے اگر وہ جنگل میں رہتی تو جنگل کہلاتی۔

مولانا ابوالکلام آزاد کے بقول

"عشق وہ دروازہ ہے جس سے گزرے بغیر انسان، انسان نہیں ہو سکتا جس کے دل و جگر میں ٹیس اور آنکھوں میں تری نہیں اس کو معنئ انسانیت سے کیا واسطہ کیونکہ دل جب تک لذت آشنائے درد نہ ہو برف کی ایک قاش ہے جس کو پانی بنتے دیکھا مگر آگ میں جلتے ہوئے کبھی نظر نہ آئی، حالانکہ انسانیت کا مفہوم یکسر سوز و گداز ہے اور عشق کا کلیسا آتش کدہ ہے یہاں وہی آتش طلب قدم رکھ سکتے ہیں جو اپنے دلوں کو اس آتش کدہ پر نذر چڑھائیں اور پھر دامن سے ہوا دیتے جائیں کہ کہیں شعلوں کی بھڑک کم نہ ہو جائے"

محبت میں انتہا اور جنون کا نام عشق ہے تاہم بعض صوفیاء فرماتے ہیں کہ عشاق کے دائمی میلان کا نام، محبوب کی خاطر تمام مال و دولت قربان کر دینا، محبوب کی موجودگی اور عدم موجودگی میں محبوب کی موافقت، عاشق کا اپنی تمام صفات کا مٹا دینا اور محبوب کو محبوب کی ذات کے ساتھ ثابت کرنا عشق کہلاتا ہے۔

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اپنی کثیر چیز کو قلیل سمجھنا اور محبوب کی قلیل چیز کو

کثیر سمجھنا عشق ہے۔ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں "عاشق کے دل میں ذکر محبوب کے سوا کچھ نہ ہو اور اپنی صفات سے غفلت ہو"۔ حضرت ابو علی رودباری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں "محبت تو اس محبوب کی موافقت ہے"۔ حضرت ابو عبداللہ قرشی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ "سچا عشق یہ ہے کہ تو اپنے آپ کو کلیتہً محبوب کے حوالے کردے"۔ حضرت ابو بکر شبلی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ "عشق دل سے محبوب کے سوا تمام چیزوں کو محو کر دیتا ہے"۔ حضرت یحییٰ بن معاذ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں "عشق وہ ہے جو جفاء پر بھی کم نہ ہو"۔

مشاہدہ ہے کہ سوئی دھاگے کے بغیر کپڑا نہیں سیتی۔ بالکل اسی طرح انسان جب تک عشقِ مجازی کا شکار نہیں ہوتا وہ کامل نہیں ہوتا۔ عشقِ مجازی کے بعد عشقِ حقیقی کی بے خودی حاصل ہوتی ہے۔ انسان کی اصل منزل عشقِ حقیقی ہے لیکن انسان کے لئے بعض صورتوں میں عشقِ حقیقی تک پہنچنے کے لئے عشقِ مجازی کی یہ شرط لازمی نہیں۔ اہلِ دانش اس امر پر اتفاق کرتے ہیں کہ طبیعت میں اگر غلبہ اور استغراق موجود ہو تو عشقِ حقیقی سے پیشتر عشقِ مجازی کی ضرورت نہیں۔ عشق سے آشنا، محفل میں تنہا رہتا ہے مگر درپردہ اپنی ذات میں انجمن ہوتا ہے اس کے اندر جذب و مستی کا طوفان برپا رہتا ہے۔ وہی عشق کی لذت جان سکتا ہے جس کو اس سے آشنائی ہو۔ اس لذت کے حصول کے بعد جنت کی طلب بھی چھوڑ دی جاتی ہے۔ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں "مجھے محبوب کی فرقت کا درد محبوب ہے اور اس کے مرہم کی مجھے کوئی ضرورت نہیں"۔ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں "میرے ساقی کی چشم مست نے مجھے ایسا مست کیا کہ اب مجھ نام و ناموس سے غرض نہیں اور نہ ہی عقل و ہوش سے کام ہے"۔

عاشق بیک وقت وصلِ محبوب کے بھی مزے لیتے ہیں اور ہجر و فراق کے تیر بھی کھاتے ہیں، بلکہ ان کو وصل سے ہجر زیادہ محبوب ہوتا ہے کیونکہ اس میں ان کو عبدیت اور بندگی کے اظہار کا زیادہ موقعہ ملتا ہے۔ علامہ اقبال نے فرمایا۔

عالمِ سوز و ساز میں وصل سے بڑھ کے ہے فراق
وصل میں مرگِ آرزو ہجر میں لذتِ طلب

عاشق دراصل وہ خوش نصیب ہے جو عشق کے نشے کے زیرِ اثر انسانیت کے اعلیٰ مدارج طے کرتا ہے۔ حسن پرستی تو مقتضائے بشریت ہے البتہ ہم اگر حسن پرستی کو نفسانی خواہشات کی تسکین کا ذریعہ قرار دے لیں تو پھر یہ عیب ہی نہیں گناہ بھی ہے۔ عشقِ حقیقی کی تازگی اور آبیاری سدابہار پھولوں کی طرح ہے۔ یہ وہ آب حیات ہے جو دل کو زندگی اور روح کو نشاط بخشتی ہے۔ اگر کوئی شخص عشقِ حقیقی کی سعادتوں سے بہرہ ور ہونا چاہتا ہے تو اسے اپنی ہستی فنا کرنا ہوگی یعنی روح کو مقدم رکھتے ہوئے وجود کا احساس ختم کرنا ہوگا۔ دوئی کا احساس جب تک باقی رہتا ہے عشق کی بارگاہِ ناز میں کوئی شنوائی نہیں ہوتی۔ جہاں وحدت ہی وحدت ہے وہاں کثرت کیسے ہو سکتی ہے۔ دوئی کا سرچشمہ نفسانی خواہشات ہیں۔ جب تک انہیں پامال نہیں کیا جائے گا منزلِ مقصود تک رسائی ناممکن ہے۔

"تذکرہ اولیاء لاہور" از محمد وارث کامل میں یہ حدیث نقل کی گئی ہے۔ "جو شخص کسی پر بے اختیار عاشق ہو جائے تو پھر عفیف رہے اور اسے مخفی رکھے پھر مر جائے تو اس کی موت شہید کی موت ہوگی"۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ غیر اختیاری عشق ہرگز مذموم نہیں۔

عشق کے بارے میں علماء اور صوفیاء میں کچھ اختلاف ہے۔ علماء عقل کو عشق پر غالب رکھتے ہیں اور صوفیاء کا عشق عقل پر غالب رہتا ہے۔ مگر انبیاء میں یہ دونوں کیفیات ہوتی ہیں۔ حضرت معاذ رازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں "عشق کا ایک ذرہ تمام انسانوں اور جنات کی اطاعت سے افضل ہے"۔ حضرت شیخ الاسلام فریدالدین عطار رحمۃ اللہ علیہ کسی کو دعا دیتے تو فرماتے۔ "خدائے عزوجل تجھے درد عطا فرمائے، جو درد بھی ہے اور دوا بھی"۔ جیسا کہ ایک شاعر نے کہا۔

یہ کم نہیں ہے کہ عشقِ نبی کے صدقے میں ملا وہ درد کہ جس کو دوا کہا جائے

معشوق کی یہی خواہش ہوتی ہے کہ اس کا عاشق صرف اسے چاہے لیکن محبوبِ حقیقی جلّ مجدہٗ چاہتا ہے کہ اس کا ہر عاشق اس کے محبوب کو چاہے اور اس عشق کے عوض خود اس کا محبوب بن جائے۔ یوں محبّ اسی صورت میں خود محبوب اسی صورت میں بن سکتا ہے جب وہ محبوب حق کے عشق میں فنا ہونے کے لئے پہلے خود محبوب کے محبوب سے عشق کی کسوٹی پر

پورا اترے۔ جب وہ کامیاب ہو جائے تو عشقِ حقیقی سے ایسے سرخرو ہو گا کہ وہ خود ذاتِ حق کا محبوب بن جائے گا۔ یہی وہ مقام ہے جسے طالبِ حق تعالیٰ اعزاز کے طور پر پاتا ہے یعنی محبوب کے محبوب کو محبوب رکھنے والا ہی محبوب کا محبوب ہو گا۔

عشق میں ایک مقام پر محب کو اپنے وجود کا احساس نہیں رہتا۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے جسم مبارک میں پیوست تیر کا نماز کی حالت میں نکالا جانا اور ان کو اس تکلیف کا احساس نہ ہونا، دراصل اسی کیفیت کی غمازی کرتا ہے۔ عاشق عشق کی بھٹی میں جل کر فنا ہو جاتا ہے۔ دیکھنے والے اسے دنیاوی نام سے پکارتے ہیں اور وہ حسب و نسب کے لحاظ سے واقعتاً بھی انسانی معاشرے کا رکن ہوتا ہے مگر درحقیقت آتشِ عشق میں جل کر وہ اپنے وجود کو مٹا دیتا ہے۔ جیسا کہ مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مثنوی میں یہ مضمون بصراحت بیان کیا ہے کہ "بھٹی میں پڑی دور سے نظر آنے والی اینٹ چشمِ بینا کے لئے ایک معمولی پتھر کی حیثیت رکھتی ہے جس کا اپنا ایک جدا گانہ وجود ہے لیکن دلِ بینا کے لئے وہ اینٹ بھٹی کی تپش کی وجہ سے درحقیقت اینٹ نہیں رہتی بلکہ اس آگ کا حصہ بن جاتی ہے یہی اینٹ بیک وقت پتھر بھی ہوتی ہے اور آگ بھی"۔

جب عشق اس مقام پر پہنچ جاتا ہے تو عاشق اپنے فانی وجود میں رہتے ہوئے بھی غیر فانی ہو جاتا ہے یہ دراصل عشقِ حقیقی کی تپش کی وجہ ہے کہ اس کو اپنے وجود کا احساس نہیں رہتا۔ جو لوگ سمندر کا سا ظرف رکھتے ہیں وہ لب بستہ رہتے ہیں اور جن کا ظرف کم ہوتا ہے وہ گھر میں اچانک آگ لگ جانے کے سبب گھبرا کر آگ آگ پکارتے ہوئے انا الحق کا نعرہ بلند کر دیتے ہیں اور دار کی زینت بن جاتے ہیں۔ اہلِ تصوف کے نزدیک یہ سزا اس جرم کا نتیجہ نہیں کہ محب نے اپنے آپ کو محبوب قرار دیا ہے بلکہ یہ تعزیر اس جرم کی پاداش میں دی جاتی ہے کہ جب محب بتدریج مراحل طے کرتا ہوا محبوب کو اپنے وجود میں پالینے کے بعد اس راز کو افشا کر دے۔ غالب نے اس موقع پر بہت خوبصورت شعر میں اس حقیقت کی ترجمانی کی ہے۔

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن | ہم کو تقلیدِ تنک ظرفیٔ منصور نہیں

اس موقع پر شاعر مشرق نے یہ کہا کہ

انا الحق جز مقامِ کبریا نیست | سزائے او چلیپا ہست یا نیست
اگر فردے بگوید سرزنش بہ | اگر قومے بگوید ناروا نیست

انا الحق وہ مقام ہے جہاں لبوں کو سی لیا جاتا ہے اس مقام پر پہنچ کر اپنی آواز اپنی نہیں رہتی بلکہ محبوبِ ازلی کی آواز بن جاتی ہے اپنا ہاتھ محبوب کا ہاتھ بن جاتا ہے اور اسی طرح اپنی آنکھیں بھی اپنی نہیں رہتیں۔ یوں کیفیت الہامی ہو جاتی ہے۔ اب منصور رحمت اللہ تعالیٰ علیہ انا الحق کہے یا شمس التبریز رحمت اللہ تعالیٰ علیہ نعرہ مستانہ بلند کرے تو حق ہے اگر حاکم وقت شمس رحمت اللہ علیہ کی کھال اتروائے یا سرمد رحمت اللہ علیہ کا سر تن سے جدا کرے یا منصور رحمت اللہ علیہ کو پیوند دار کرے تو روا ہے کیونکہ یہ وہ سزا ہے کہ خود مارنے والے مر گئے اور مرنے والے مرتے مرتے زندہ ہو گئے۔ اگر اس پیالے میں زہر موجود ہوتا تو سقراط مر گیا ہوتا۔

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

کتابیات

(۱) فتوح الغیب از حضرت شیخ عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ۔

(۲) انوارِ علی کرم اللہ وجہہ شرح خصائص نسائی، مترجم و شارح (فقیر) سید محمد امیر شاہ قادری گیلانی۔

(۳) رسالہ قشیریہ از امام ابو القاسم عبد الکریم بن ہوازن قشیری رحمۃ اللہ علیہ۔

(۴) کشف المحجوب از علی بن عثمان ہجویری رحمۃ اللہ علیہ۔

(۵) فوائد الفواد از حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ۔

(۶) طواسین از حضرت حسین بن منصور حلاج رحمۃ اللہ علیہ (شہید عشق)

(۷) تعرف از حضرت امام ابو بکر بن ابو اسحاق محمد رحمۃ اللہ علیہ۔

استفتاء

(نمازِ عید کے بعد مصافحہ اور معانقہ)

مفتی خلیل الرحمٰن قادری گلوزوی

مہتمم دارالعلوم شیر ربانی حاجی آباد شکرپورہ روڈ پشاور

کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ کے بارے میں: ہمارے یہاں لوگ نمازِ عید کے بعد آپس میں مصافحہ اور معانقہ کرتے ہیں۔ واضح ہو کہ اس فعل پر کچھ لوگوں نے اعتراض کیا ہے کہ اس کی شریعتِ محمدیہ میں کوئی اصل نہیں۔ براہِ کرم مسئلہ مذکورہ کی وضاحت شریعتِ محمدیہ اور خصوصاً فقہ حنفی کی روشنی میں فرما کر شکریہ کا موقع دیں۔

المستفتی: مولانا محمد متین خطیب چمکنی ضلع پشاور۔

الجواب

واضح ہو کہ عیدین وغیرہ میں مصافحہ اور معانقہ پر اعتراض کرنا اور یہ کہنا کہ اس کی شریعت میں کوئی اصل نہیں یہ تو وہی بات ہوئی کہ چوری اور سینہ زوری۔ معترضین کی ان باتوں سے بخوبی معلوم ہوا کہ بچارے علمی بصیرت سے بالکل محروم ہیں ورنہ ایسی باتیں منہ سے نہ نکالتے۔ مقدس دینِ اسلام کا ہر فعل چاہے دین سے وابستہ ہو یا دنیا سے بے شمار خوبیوں سے لبریز ہوتا ہے۔ مسلمانوں کے اکثر امور دینی نقطۂ نگاہ سے آپس میں مشترک ہیں جبکہ ہر ایک فعل بذات خود ان گنت فوائد سے مملوّ ہوتا ہے۔ دنیاوی لحاظ سے زندگی گزارنے کے لئے اور مسلمانوں کے آپس میں مل جل کر ایک معاشرے میں رہنے کے لئے بھی ربِ ذوالجلال نے کچھ ایسے آداب مقرر فرمادیئے ہیں جن پر عمل کرنے سے ان کے دلوں میں ایک دوسرے کے ساتھ محبت اور شفقت بڑھتی ہے اور اخوتِ اسلامی کو تقویت ملتی ہے جو انما المؤمنون اخوۃ سے ثابت ہے۔ انہیں آداب میں سے ایک اہم امر یہ ہے کہ مسلمان آپس میں ملاقات کرتے وقت السلام علیکم کہیں۔ دینی لحاظ سے بھی اس میں فائدہ ہے اور وہ یہ کہ اس کے عمل نامے میں دس نیکیاں لکھی

جاتی ہیں اور دنیاوی لحاظ سے بھی آپس میں محبت بڑھتی ہے اور دلوں کو سرور میسر آتا ہے اور اس کی اصل بھی ہے جو بہت قدیم ہے۔

حدیث شریف میں ہے جس کو بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے۔

عن ابی ہریرة قال قال رسول اللہ ﷺ خلق اللہ آدم علی صورتہٖ طولہٗ ستون ذراعًا فلما خلقہٗ قال اذہب وسلم علیٰ اولٰئک النفر وہم نفر من الملائکۃ جلوس فاستمع مایحیونک فانہا تحیتک وتحیۃ ذریتک فذہب فقال السلام علیکم ۔ الخ۔

(الحدیث بطولہٖ متفق علیہ مشکوٰۃ شریف ص۳۹۷)

ترجمہ: روایت ہے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرماتے ہیں فرمایا رسول اللہ ﷺ نے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو اپنی صورت پر پیدا کیا جن کے قد کی لمبائی (شرعی گز) کے مطابق ساٹھ گز تھی جب انہیں پیدا کیا تو فرمایا جاؤان پر سلام کرو وہ فرشتوں کی ایک جماعت تھی بیٹھی ہوئی اور غور سے سنو کہ وہ تمہیں کیا جواب دیتے ہیں پھر وہی تمہارا اور تمہاری اولاد کا تحیہ ہے چنانچہ آپ گئے تو کہا "السلام علیکم" ان سب سے کہا السلام علیکم ورحمت اللہ۔ انہوں نے رحمت اللہ بڑھادیا تو جو بھی جنت میں جائے گا حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی صورت پر ہوگا اور اس کا قد ساٹھ گز ہوا پھر آدم علیہ السلام کے بعد مخلوق گھٹتی رہی (مخلوق کا قد گھٹتا رہا) حتی کہ اب تک۔ (بخاری و مسلم ص ۱۱۳ جلد ۶ مرآۃ المناجیح)

اس حدیث شریف سے معلوم ہوا کہ سلام کا عند اللہ کیا مقام ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو فرشتوں کو سلام کرنے اور ان کا جواب سننے کا حکم فرمایا اور یہ بھی بتادیا کہ یہی تیری اولاد کا تحیہ ہے اس حدیث شریف سے تو لی سلام کی اصل بھی معلوم ہو گئی۔ سلام کے بارے میں بہت زیادہ احادیث شریف وارد ہیں مگر یہاں مختصرا دو تین احادیث شریف پیش خدمت ہیں۔

عن عبداللہ بن عمرو ان رجلا سئل رسول اللہ ﷺ ای الاسلام خیر قال تطعم

الطعام وتقرئ السلام علی من عرفت ومن لم تعرف

(متفق علیه مشکوٰۃ المصابیح ص۳۹۷)

ترجمہ: روایت ہے حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے کہ ایک شخص نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ کونسا اسلام اچھا ہے (یعنی اسلامی کاموں میں کونسا کام اچھا ہے) فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھانا کھلاؤ اور سلام کرواسے، جسے پہچانو یا نہ پہچانو۔ (مسلم وبخاری)

تنبیہ: معلوم رہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جوابات سائل کے حال کے مطابق ہوتے تھے اس لئے اس سوال کے جواب مختلف دیئے، کسی سے فرمایا کہ بہترین عمل نماز ہے کسی سے فرمایا جہاد ہے اور یہاں فرمایا بہترین عمل کھانا کھلانا اور سب کو سلام کرنا ہے۔

عن ابی هریرة رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لاتدخلون الجنة حتیٰ تؤمنوا ولا تؤمنوا حتیٰ تحابوا اولادلکم علی شیئی اذا فعلتموہ تحابیتم افشو السلام بینکم

(رواہ مسلم ص۱۹۷ مشکوٰۃ شریف)

ترجمہ: روایت ہے حضرت ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ سے فرماتے ہیں کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ تم جنت میں نہ جاؤ گے حتیٰ کہ مؤمن بن جاؤ اور مؤمن نہ ہو گے حتیٰ کہ آپس میں محبت کرو، کیا میں تمہیں اس پر رہبری نہ کروں کہ جب تم وہ کر لو تو آپس میں محبت کرنے لگو اپنے درمیان سلام پھیلاؤ (مسلم صفحہ ۳۱۶ مرآۃ جلد ۶)

ان احادیث مبارکہ سے سلام کی اہمیت کا اندازہ بخوبی ہو گیا اور سلام کی اصل بھی معلوم ہو گئی نیز سلام کی فضیلت بھی جبکہ السلام علیکم کہنے سے دس نیکیاں اعمال نامے میں لکھی جاتی ہیں جس کا ذکر عمران بن حصین کی روایت میں ہے جسے ترمذی شریف اور ابو داؤد نے روایت کیا ہے۔

دوسرا اہم فعل جو دینی اور دنیاوی فوائد سے لبریز ہے اسے مصافحہ کہتے ہیں اور تیسرا معانقہ ہے پہلے مصافحہ کے بارے میں عرض کرتا ہوں مصافحہ صفح سے ہے یعنی کشادگی اور چوڑائی

اسی لئے دروازے کے تختوں کو صفائح الباب کہتے ہیں اور تلوار کی چوڑائی کو صفح السیف کہتے ہیں لہذا مصافحہ کے معنی ہیں ہاتھ کی چوڑائی یعنی ہتھیلی کو دوسرے کی ہتھیلی سے ملانا۔

المصافحه فی الافضاء بصفحة الید الی صفحه الید و اول من اظهر ها اهل الیمن (مشکوٰۃ شریف . باب المصافحه حاشیه ٦)

ترجمہ: مصافحہ کا معنی یہ ہے کہ ہاتھ کی چوڑائی یعنی ہتھیلی کو دوسرے کی ہتھیلی سے ملایا جائے اور مصافحہ کی ابتداء اہلِ یمن نے کی۔

وہ یمن جس کے لئے محبوب کبریا ﷺ نے ان الفاظ میں دعاء فرمائی تھی اللهم بارك لنا فی یمننا یعنی "یا اللہ تو ہمارے یمن میں برکت دے" انتہی۔

سلام کی طرح مصافحہ کرنے سے بھی مسلمانوں کی آپس میں محبت بڑھتی ہے اور اس سے اللہ تعالیٰ گناہ بھی بخش دیتا ہے اور مصافحہ حضور ﷺ کی سنت ہے۔ حدیث شریف ہے

عن قتادة قال قلت لانس اکانت المصافحة فی اصحاب رسول الله صلی الله علیه و آله وسلم قال نعم (رواه البخاری مشکوٰۃ ص ۴۰۱)

ترجمہ: روایت ہے حضرت قتادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرماتے ہیں میں نے حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کہا کہ کیا رسول اللہ ﷺ کے صحابہ میں مصافحہ مروج تھا تو انہوں نے فرمایا ہاں یعنی بوقتِ ملاقات مصافحہ کرنا سنتِ صحابہ بلکہ سنتِ رسول ﷺ ہے۔ (مرآۃ جلد ۶، صفحہ ۳۵۵)۔

دوسری حدیث شریف میں ہے

عن البراء بن عازب قال قال النبی ﷺ مامن مسلمین یلتقیان فیتصا فحان الاغفر لهما قبل ان یتفرقا۔ (رواه احمد و ترمذی و ابن ماجه مشکوٰۃ شریف و مراۃ جلد ٦ ص ٣٥٦)

ترجمہ: روایت ہے حضرت براء بن عازب رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں، فرمایا نبی کریم ﷺ نے کوئی دو مسلمان نہیں جو آپس میں ملیں پھر مصافحہ کریں مگر ان کے جدا ہونے سے پہلے دونوں

بخش دیئے جاتے ہیں۔

تیسری حدیث شریف جسے ابو داؤد نے روایت کیا ہے۔

عن ایوب بن بشیر عن رجل من عنزة انہٗ قال قلت لابی ذر ھل کان رسول اللہ ﷺ یصا فحکم اذا لیقتموہ قال مالقیتہ قط الا صافحنی ۔ (الحدیث بطولہ رواہ ابو داؤد ص۳۵۹ مرأۃ جلد ۶)

ترجمہ: روایت ہے ایوب لن بشیر سے وہ عنزہ کے ایک شخص سے روای ہے فرمایا انہوں نے کہ میں نے ابوذر سے کہا کہ کیا نبی کریم ﷺ جب تم سے ملتے تو تم سے مصافحہ کرتے تھے اس نے فرمایا کبھی ایسا نہ ہوا کہ میں حضور ﷺ سے ملا ہوں اور مجھ سے مصافحہ نہ کیا ہو۔ حضور ﷺ نے مجھے ایک دن بلایا اور میں اپنے گھر میں نہ تھا پھر جب میں آیا تو مجھے خبر دی گئی تو میں حضور ﷺ کے پاس آیا آپ ایک تخت پر تھے مجھے لپٹا لیا (یعنی معانقہ فرمایا) تو یہ بہت اچھا ہوا بہت اچھا ہوا۔ "اشعۃ اللمعات" میں ہے کہ اس سے معلوم ہوا کہ معانقہ صرف سفر سے آنے پر ہی نہیں ہوتا بلکہ اس کے علاوہ حالت میں بھی ہو سکتا ہے اور ابو ذر رضی اللہ عنہ نے اس کو بہت اچھا اس لئے فرمایا کہ مصافحہ میں صرف ہاتھ ملتے ہیں اور معانقہ میں گلا، سینہ وغیرہ سب ہی مل گئے فیضان جو معانقہ میں ہوا وہ مصافحہ کے فیضان سے زیادہ تھا۔ (صفحہ ۳۶۰ ج ۶ مرآۃ)

ان احادیث شریف سے معلوم ہوا کہ مصافحہ کرنا مسلمانوں کے لئے آپس میں دینی اور دنیاوی نقطۂ نگاہ سے کتنا فائدہ مند ہے جس سے محبت بڑھتی ہے، حسد دور ہوتا ہے، دل کو سرور ہوتا ہے، گناہ معاف ہوتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ نیز ان روایات سے مصافحہ کی اصل بھی معلوم ہوگئی۔ بعض علماء مصافحہ کو عیدین یا جمعہ یا دوسری نمازوں کے بعد مکروہ اور بدعت کہتے ہیں لیکن صحیح بات یہ ہے کہ مصافحہ عند الملاقات بعد سلام کے سنتِ رسول ﷺ اور سنتِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہے بعض عوام نماز عیدین یا جمعہ یا صبح اور عصر نماز کے بعد جو مصافحہ کرتے ہیں اگرچہ ابتداء میں اس کا رواج نہ تھا لیکن اس کی اصل شریعت میں موجود ہے لہٰذا علماءِ کرام نے اسے

بدعت مباحہ کہا ہے۔ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے جو مشکوٰۃ شریف میں باب المصافحہ کے حاشیہ ۲ میں ہے۔

اعلم ان المصافحة سنة مستحبة عند كل لقاء وما اعتاده الناس بعد صلوٰة الصبح والعصر بطوله الى آخره (باب المصافحه مشكوٰة شريف ص ۴۰۱ حاشيه ۶)

ترجمہ :۔ جان لو یہ بات کہ مصافحہ سنتِ مستحبہ ہے ملاقات کے وقت اور وہ جو لوگوں نے نمازِ صبح اور نمازِ عصر کے بعد رائج کیا ہے تو اس لحاظ سے شریعت میں اس کی اصل نہیں باوجود اس کے کہ نمازِ صبح اور نمازِ عصر کے بعد مصافحہ کرنے میں کوئی حرج نہیں کیونکہ اصل میں مصافحہ سنت ہے اور لوگ اس کی حفاظت کرتے ہیں اگرچہ بعض احوال میں تجاوز کر لیتے ہیں تو اس تجاوز سے مصافحہ کی سنت میں کوئی فرق نہیں آتا اور نہ یہ درجہ کراہت و بدعت میں ہے اس لئے کہ بدعت وہ ہوتی ہے جس کی شریعت میں کوئی اصل نہ ہو للہذا مصافحہ عیدین کے بعد ہو یا جمعہ یا دوسری نمازوں کے بعد بدعتِ مباحہ ہے جس کے کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ ترمذی شریف نے بھی حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ کی روایت کردہ حدیث شریف نقل کی ہے اور فرمایا، هذا حديث حسن صحيح (ترمذی شریف ص ۱۰۲ ج ۲)

جاء الحق میں حوالہ در مختار جلد ۵ باب المصافحہ والاستبراء میں ہے۔

اى كما تجوز المصافحة ولو بعد العصر وقولهم انه بدعة اى مباحة حسنة كما افاده النووى رحمة الله عليه فى اذكاره (ص ۳۲ ج ۱ جاء الحق)

ترجمہ : یعنی مصافحہ جائز ہے اگرچہ نماز عصر کے بعد ہو (اسی طرح دوسری نمازوں کے بعد) اور فقہا کا فرمانا کہ مصافحہ نمازِ عصر کے بعد بدعت ہے یعنی بدعتِ مباحہ حسنہ ہے جیسا کہ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے اذکار میں فرمایا۔

ملفوظات حضرت امامِ اہلِ سنت شاہ احمد رضا خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ ج ۱ ص ۹۷ پر ہے

سوال :۔ نماز جمعہ یا عیدین یا بعد صلوٰۃِ پنج گانہ مصافحہ کرنا کیسا ہے؟

جواب :۔ جائز ہے نسیم الریاض میں ہے الاصح انها بدعة مباحة یعنی صحیح یہ ہے کہ عیدین وغیرہ کے بعد مصافحہ کرنا بدعت ہے۔

ان روایات اور تصریحات سے ثابت ہوا کہ مصافحہ اصلاً سنت ہے اور کیفیت اس کی یہ ہے کہ عند الملاقات سلام کے بعد دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کرنا چاہئے بااین ہمہ اگر کوئی عیدین وغیرہ کے بعد مصافحہ کرے تو عند الفقہاء یہ مباح ہے جس میں کوئی گناہ اور حرج نہیں اور ایسے لوگوں کے ساتھ تشدد کرنا صحیح نہیں۔

كما صرح به الفقهاء فی الدر المختار والقنية و نسیم الرياض وغیرہ.

معانقہ: انہیں آداب مشروعہ میں سے ایک اہم فعل معانقہ ہے لہٰذا معانقہ کے بارے میں قدرے وضاحت ضروری ہے اس لئے کہ سلام، مصافحہ اور معانقہ ان تینوں امور کا تعلق مسلمانوں کے آپس میں ملنے جلنے اور رہن سہن سے ہے۔ معانقہ عنق سے بنا ہے بمعنیٰ گردن اور گلا اور معانقہ کا معنیٰ ہے کسی کو گلے لگانا۔ معانقہ احادیث سے ثابت ہے۔ ترمذی شریف نے ایک حدیث نقل کی ہے جس سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا معانقہ کرنا ثابت ہے اور اس حدیث شریف کو مشکوٰۃ شریف وغیرہ نے بھی روایت کیا ہے۔

عن عائشة رضی الله قالت قدم زيد بن حارثة المدينة ورسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فی بیتی (الحديث بطوله مشكوٰة ص۴۰۲ ترمذی ج۲ ص۱۰۲)

ترجمہ: روایت ہے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے، فرماتی ہیں کہ زید ابن حارثہ مدینہ آئے (کسی جہاد یا سفر سے) اور رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم میرے گھر میں تھے وہ حضور علیہ السلام کے پاس آئے تو دروازہ کھٹکھٹایا تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کی طرف چلے کپڑا کھینچتے ہوئے برہنہ، یعنی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے چادر اوڑھنے یا قمیص پہننے کے لئے توقف نہ فرمایا بلکہ قمیص پہنتے ہوئے یا چادر اوڑھتے ہوئے ان کی طرف بڑھے۔ (برہنہ کے یہی معنیٰ ہیں) یہاں تک کہ حضورِ انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے زید کو گلے لگالیا اور ان کو چوما۔

وضاحت: زید ابن حارثہ کو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنا بیٹا بنایا تھا اور غالباً وہ کہیں سفر سے آئے تھے اور یہ خوشی کا موقع تھا۔ لہٰذا اس حدیث شریف سے ثابت ہے کہ خوشی کے موقع پر گلے ملنا سنت ہے۔ اس لئے لوگ عیدین کے موقع پر آپس میں معانقہ کرتے ہیں کیونکہ وہ خوشی کے دن ہیں لہٰذا عیدین کے معانقہ کو حرام نہیں کہا جاسکتا۔

(مرآۃ المناجیح جلد ۶، صفحہ ۳۵۹)

اسی طرح معانقہ کا جواز جاء الحق جلد اول پر بھی مذکور ہے ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔ "ملفوظات احمد رضا خان" میں ہے۔

سوال: معانقہ ایک جانب سے یا دونوں سے کرے؟

جواب: ایک طرف سے بھی ہو جائے گا لیکن عرب میں معانقہ دونوں طرف سے کرتے ہیں۔ (ص ۸۷ ج اول ملفوظات امام اہل سنت شاہ احمد رضا خان۔)

یہ بھی معلوم ہوا کہ معانقہ کی ابتدا حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے کی۔

تفسیر روح البیان میں ہے۔

عن ابن عباس رضی اللہ عنہما کان ابراهیم علیه السلام بمکه فاقبل الیها ذوالقرنین فلما کان با الابطح قیل له فی هذه البلدة ابراهیم خلیل الرحمٰن فقال ذوالقرنین ما ینبغی لی ان ارکب فی بلدة فیها ابراهیم خلیل الرحمٰن فنزل ذوالقرنین و مشی الی ابراهیم علیه السلام فسلم علیه واعتنقه فکان هو اول من عانق عندالسلام کما فی انسان اعلیون و در رالغرر. (بطوله ص ۲۹۱ ج ۵ تفسیر روح البیان)

ترجمہ: روایت ہے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام مکہ شریف میں تشریف فرما تھے اسی دوران سکندر ذوالقرنین نے مکہ شریف جانے کا ارادہ کیا پس جس وقت ابطح پہنچے تو کسی نے ان سے کہا کہ اس شہر (بستی) میں حضرت ابراہیم خلیل اللہ رہتے ہیں تو سکندر ذوالقرنین نے کہا کہ میرے لئے یہ مناسب نہیں کہ میں سوار ہو کر چلوں ایسی بستی میں جس

میں حضرت ابراہیم علیہ السلام سکونت پذیر ہیں۔ پس سکندر ذوالقرنین اپنے گھوڑے سے نیچے اتر آئے اور پاپیادہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس پہنچے تو انہوں نے سلام کیا اور پھر دونوں نے آپس میں معانقہ فرمایا۔

اس لحاظ سے معانقہ گو سنتِ ابراہیمی ہے جو ہمارے دینِ اسلام میں بھی مشروع ہے۔ مگر یاد رکھنا چاہئے کہ برہنہ حالت میں معانقہ نہ کرنا چاہئے علاوہ یہ کہ امرد لڑکے سے بھی معانقہ جائز نہیں۔

عقلمند را حرفے بس است و لہٰذا مختصر کردم

واللہ اعلم بالصواب

بقیہ : یوم شہادت علی علیہ السلام

سے پہنچ چکی تھی۔ ام المومنین غم سے نڈھال اور آنسوؤں سے تربتر بیٹھی ہیں، لوگوں نے ان کی یہ حالت دیکھی تو خاموشی سے لوٹ آئے۔ حضرت زید فرماتے ہیں کہ دوسرے روز مشہور ہوا کہ ام المومنین رسول اللہ ﷺ کے روضۂ اطہر پر جا رہی ہیں۔ چنانچہ مسجد میں جتنے بھی مہاجرین اور انصار تھے وہ سب استقبال کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے اور سلام کرنے لگے۔ ام المؤمنین شدتِ غم سے خاموش تھیں اور کچھ بول نہیں رہی تھیں، دل پریشان تھا، چادر بار بار پاؤں میں الجھتی تھی اور لڑکھڑا جاتی تھیں بدقت تمام پہنچیں تو لوگ پریشان حال پیچھے پیچھے آرہے تھے، حجرہ میں داخل ہوئیں تو دروازہ پکڑ کر کھڑی ہو گئیں اور ٹوٹی ہوئی آواز میں کہنے لگیں "اے نبیٔ ہدایت (ﷺ)! آپ پر سلام اور آپ کے دونوں ساتھیوں پر سلام، میں آپ کے محبوب ترین عزیز کی موت کی خبر آپ کو سنانے آئی ہوں۔ خدا آپ کا چنا ہوا عزیز اور منتخب کیا ہوا عزیز قتل ہو گیا۔ واللہ وہ قتل ہو گیا جو ایمان لایا اور اس عہد پر پورا اترا۔ میں اس پر آنسو بہانے اور دل جلانے والی ہوں اگر قبر کھل جاتی تو آپ (ﷺ) کی زبان مبارک بھی یہی کہتی کہ آپ کا عزیز ترین اور افضل ترین وجود قتل ہو گیا۔